

تذکرہ قرآن

۸۰

عبس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ————— المذمت ————— کے جوڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اسلوب بیان اور مواد استدلال میں بھی دونوں کے اندر نہایت واضح یکسانی ہے۔ مطالب کی ترتیب میں البتہ تبدیلی ہوئی ہے جس سے ایک نیا حسن اس میں پیدا ہو گیا ہے اور دراصل یہی واحد چیز ہے جو اس سورہ کو سابق سورہ سے ممتاز کرنے والی ہے۔ آپ دونوں کو سامنے رکھ کر آسانی سے ان کے ماہ الاشترک اور ماہ الاختلاف کو معین کر سکتے ہیں۔

سابق سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے یہ جو فرمایا ہے کہ اِنَّمَا اَنْتَ مُنذِرٌ مِّنْ يَّحْشَاہَا (۴۵) تم تو بس انہی لوگوں کو قیامت سے ڈرا سکتے ہو جو اس سے ڈرنے والے ہوں اسی مضمون سے اس سورہ کی تمہید استوار فرمائی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بانڈاز عتاب قریش کے ان متمرّدین کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا ہے جو ایمان نہ لانے کے روز روز نئے نئے بہانے تلاش کرتے اور نازک مزاجی میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ آپ سے مطالبہ کرتے تھے کہ جب تک آپ اپنے غریب ساتھیوں کو اپنے پاس سے ہٹا نہیں دیں گے اس وقت تک وہ آپ کی مجلس میں بیٹھنے کے روادار نہیں ہوں گے، اس پوری سورہ میں انہی متمرّدین پر نہایت شدت سے عتاب ہے۔ اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن عتاب کا رخ تمام قریش کے فراعنہ ہی کی طرف ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے :

(۱۰ - ۱) ایک واقعہ کے تعلق سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کہ جو لوگ اپنے کبر و غرور کے سبب سے تمہاری تعلیم و تذکیر سے مستغنی اور اس بات کے متمنی ہیں کہ تم اپنے غریب ساتھیوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو تب وہ تمہاری مجلس میں بیٹھنے کے روادار ہوں گے، ان کی ناز برداری کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔

ان کے ایمان کی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے کہ تم ان کی ناز برداری میں اپنے جان نثار سنا بھیجوں
کی حق تکلفی کرو۔ تمہارے اوپر اصل ذمہ داری انہی کی تربیت کی ہے جو تمہارے پاس ذوق و شوق سے آتے
ہیں۔ جو نہیں آتے اور اپنی ناز برداری کے طالب ہیں ان کے بارے میں تم مسئول نہیں ہو کہ ان کو پانے
کے لیے اپنیوں کو ضائع کر دو۔

(۱۱-۱۶) قرآن کی عظمت کا بیان کہ یہ اللہ کی نازل کی ہوئی یاد دہانی ہے تو جس کا جی چاہے اس
سے فائدہ اٹھائے۔ جو اس کی ناقدری کریں گے وہ اس کا نتیجہ خود بھگتیں گے یہ اللہ رب العالمین کا فرمان
واجب الازمان ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ اس کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش
کر دو جو اس کے شایان شان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کی امانت میں اس کو محفوظ کیا ہے سب عالی مقام
اور بلند مرتبہ لوگ ہیں اور تم بھی انہی کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے ہو۔ مگر کشوں اور مغروروں کی ناز برداری
میں اتنا زجھکے جو تمہارے منصب اور تمہارے اس پیغام کے وقار کے خلاف ہے۔

(۱۶-۲۳) ان مگر کشوں کی حالت پر اظہارِ افسوس جو قیامت کے انکار پر اڑے ہوئے ہیں۔ ان
کو خود ان کی خلقت اور زندگی کے مراحل کی یاد دہانی کہ جو انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے اور
مختلف مراحل طے کرتا ہوا قبر تک پہنچتا ہے حیف ہے اگر وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو
ناممکن سمجھے! جو اتنے واضح دلائل کے بعد بھی سمجھنے اور ماننے پر تیار نہیں ہوا وہ کسی دلیل سے بھی قائل
نہیں ہو سکتا۔

(۲۲-۳۲) خلقت اور مراحل زندگی کی طرف توجہ دلانے کے بعد ربوبیت کے اس وسیع اہتمام
کی طرف اشارہ جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور چوپایوں کے لیے اس دنیا میں کر رکھا ہے اور جو اس امر
کی نہایت واضح شہادت ہے کہ جس نے یہ سارا اہتمام کیا ہے وہ لوگوں کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا
بلکہ ایک دن وہ سب سے ان نعمتوں کا حساب لے گا۔ اس دن فائز المرام وہی ہوں گے جنہوں نے
نعمتوں کا حق ادا کیا ہوگا جنہوں نے ان کا حق ادا نہیں کیا ہوگا وہ سب اس دن ذلیل و نامراد ہوں گے۔
(۳۲-۴۲) قیامت کے دن کی تصویر۔ اس دن ہر شخص پر نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اسی
کا نقشہ۔ جن لوگوں نے قیامت کی پیشی سے ڈرتے ہوئے زندگی گزار لی ان کی شادمانی اور جو اس سے
بے فکر رہے اور اسی حال میں مرے ان کی بدبختی و سیر روٹی کا بیان۔

سُورَةُ عَبَسَ

مَكِّيَّةٌ ————— آيات: ٢٢

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 عَبَسَ وَتَوَلَّى ① أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ② وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ ③
 يَزْكَى ④ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَى ⑤ أَمَا مِنْ اسْتَعْجِلِ ⑥
 فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّى ⑦ وَمَا عَلَيْكَ الْإِيزَى ⑧ وَأَمَا مِنْ جَاءَكَ
 يَسْعَى ⑨ وَهُوَ يَخْشَى ⑩ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَى ⑪ كَلَّا إِنَّهَا
 تَذِكْرَةٌ ⑫ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ⑬ فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ ⑭ وَقَفَّالَهُ
 مَرْفُوعَةٍ مُطَهَّرَةٍ ⑮ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ⑯ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ⑰
 قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ⑱ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ⑲ مِنْ
 نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ⑳ ثُمَّ اسْبِغْ لَهُ يَسْرَهُ ㉑ ثُمَّ
 أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ㉒ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ ㉓ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ
 مَا أَمَرَهُ ㉔ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ㉕ أَنَا صَبَبْنَا
 الْمَاءَ صَبًّا ㉖ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ㉗ فَانْبَثْنَا فِيهَا
 حَبًّا ㉘ وَعَنْبًا وَقَضْبًا ㉙ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ㉚ وَحَدَائِقَ
 غُلْبًا ㉛ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ㉜ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ㉝ فَإِذَا

آيات
٢٢-١

وقفَّالَهُ

جَاءَتِ الصَّاحَّةُ ۞ (۳۳) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۞ (۳۴) وَأُمِّهِ
 وَأَبِيهِ ۞ (۳۵) وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۞ (۳۶) لِكُلِّ امْرِيٍّ مِنْهُمْ
 يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۞ (۳۷) وَجُودًا يَوْمَئِذٍ مُسْفِرَةٌ ۞ (۳۸)
 ضَاحِكَةٌ مُسْتَبْشِرَةٌ ۞ (۳۹) وَوَجُودًا يَوْمَئِذٍ عَلَيْهِا غَبْرَةٌ ۞ (۴۰)
 تَرَهُمْ مَقْتَرَةً ۞ (۴۱) أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجْرَةُ ۞ (۴۲)

۱
۵

ترجیبات

۲۲-۱

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ آیا اس کے پاس تابینا اور تمہیں کیا معلوم
 شاید وہ اپنی اصلاح کرتا یا نصیحت سنتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچتی! ۱-۲
 جو بے پروائی برتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری
 نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے اور جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ
 خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو۔ ۵-۱۰
 ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاد دہانی ہے تو جو چاہے یاد دہانی حاصل کرے۔
 لائق تعظیم، بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں، معزز بادشاہوں کے ہاتھوں میں۔ ۱۱-۱۶
 بُرا ہوا آدمی کا، یہ کتنا ناشکر ہے! اسے کس چیز سے پیدا کیا؟ پانی کی ایک
 بوند سے! اس کو پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا۔ پھر اس کے
 لیے راہ آسان کر دی۔ پھر اس کو موت دی۔ پھر اس کو دفن کرایا پھر جب چاہے گا
 اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔ ۱۷-۲۲

ہرگز نہیں، اس نے اس حکم کی تعمیل اب تک نہ کی جو اس کے رب نے اسے
 دیا۔ پس انسان اپنی غذا پر دھیان کرے کہ ہم نے برسا یا پانی اچھی طرح، پھر پھاڑا

زمین کو اچھی طرح - پھرا گائے اس میں غلے، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجور، گھنم
 باغ، میوے اور سبزہ، تمھاری اور تمھارے مویشیوں کی نفع رسانی کے لیے۔ ۲۳-۳۲
 پس جب وہ کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز آئے گی! (تب وہ شدنی ظاہر
 ہوگی) اس دن آدمی اپنے بھائی، ماں باپ اور اپنی بیوی اور بیٹیوں سے بھاگے گا۔
 اس دن ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے،
 ہشاش بشاش! اور کتنے چہروں پر اس دن خاک اڑتی اور سیاہی چھائی ہوگی۔ یہی
 کافروں کا بکار ہوں گے! ۳۳-۴۴

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ ۖ اِنْ جَاءَهُمُ الْاَعْمٰی (۱-۲)

عَبَسَ کا فاعل یہاں مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ فاعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اَعْمٰی سے یہاں اشارہ، تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف ہے۔ یہ ایک نادار اور نابینا صحابی تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے لیڈروں میں سے کسی سے یا ان کی کسی جماعت سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ نے ان کے ساتھ اسلام پیش کیا تھا اور وہ اپنے اعتراضات و شکوک پیش کر رہے ہوں گے کہ اسی اشارہ میں عبداللہ بن ام مکتوم تشریف لائے اور موقع کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکنے کے باعث وہ بھی مجلس میں نہنچ گئے۔ ان کا یہ بے موقع آجانا حضور کو ناگوار گزرا۔ اس ناگواری کی وجہ العیاذ باللہ یہ تو نہیں ہو سکتی کہ وہ نادار یا نابینا تھے، ناداروں اور نابیناؤں کی قدر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کر سکتا تھا، البتہ حضور کو اندیشہ ہوا ہو گا کہ ان دشمنوں کو ذرا مانوس کرنے کا جو موقع میسر آیا ہے عبداللہ بن ام مکتوم کے آجانے سے وہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ بے جا نہیں گے اور کہیں گے کہ جب تم نے اس طرح کے مفلسوں اور تلامذوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کیا ہے تو تمہاری مجلس میں بیٹھ کر کون اپنی عزت گنوائے گا۔

یہ امر واضح رہے کہ قریش کے فراعنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات تھے ان میں ایک بڑا اہم اعتراض یہی تھا کہ آپ کے ساتھی تلاش اور مفلس لوگ ہیں۔ اس چیز کو وہ آپ کی نبوت کے خلاف ایک دلیل بناٹے بیٹھے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کے لیے یہ خیال بھی باعث تردد ہوا ہو گا کہ ممکن ہے یہ اپنی بڑائی کے نشہ میں آپ کے ایک محبوب صحابی کی کوئی توہین یا دل آزاری کر بیٹھیں جس سے مزید بدمزگی پیدا ہو۔

اسی واقعہ کو، جو بالکل اتفاق سے پیش آ گیا، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دینے کا ذریعہ بنا لیا کہ آپ اپنی ترجمہ کا اصل مرکز اپنے ان صحابہ کو بنائیں جو اپنی اصلاح و تربیت کے طلب اور شوق و ذوق سے آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں، ان لوگوں کے درپے زیادہ نہ ہوں جو بے نیاز ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ ان کی نادر داری کریں۔

چھٹل سو توڑی میں یہ بات جگہ جگہ واضح ہو چکی ہے کہ ابتدا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں کو دعوت دینے کا خاص اہتمام تھا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ آپ کو اول اول، جیسا کہ آیت

عبداللہ بن
ام مکتوم تھے
واقعہ کی ذمیت

قریش کے
لیڈروں کی
نازک مزاجی

مذہبوں کو
نظر انداز کرنے
کی ہدایت

وَإِذْ دُعِيتُمْ لِلْقُرْبَانِ (الشعراء: ۲۱۴-۲۱۵) سے واضح ہے، انہی کو خطاب کرنے کا حکم ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ ان لوگوں کو پورے عرب کی سیادت و قیادت حاصل تھی۔ توقع تھی کہ اگر یہ دعوت قبول کر لیں گے تو پورے عرب میں دعوت کی کامیابی کی راہ کھل جائے گی۔ چنانچہ کچھ عرصے تک حضور نے اپنا سارا زور انہیں پر صرف فرمایا اور ان کی طرف سے انتہائی رعوت اور توہین و دل آزاری کے اظہار کے باوجود آپ ان کو دعوت دینے میں لگے رہے لیکن جب ان کی رعوت بہت بڑھ گئی اور یہ واضح ہو گیا کہ یہ ہٹ دھرم نہ صرف یہ کہ کوئی اصلاح قبول کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے جو وقت ضائع ہو رہا ہے اس سے ان غریب مسلمانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے جو ایمان لائے ہیں اور جو اپنی تعلیم و تربیت کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کے ان ناقدروں سے زیادہ مستحق ہیں تو آپ کو ان کے زیادہ درپے ہونے سے روک دیا گیا اور اس کے لیے عبداللہ بن ابی مکتوم کے واقعہ نے ایک نہایت مناسب موقع تقریب پیدا کر دیا۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّه يَنْزِكِي ۗ أَدِيدًا كَذَلِكَ فَتَنْفَعَهُ السُّؤْرَى (۳-۴)

ادریک آیات سے صرف ایک واقعہ کی خبر سامنے آئی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کس کا ہے اور نہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے ذکر سے مقصود کیا ہے لیکن یہاں ایدد کے خطاب سے یہ بات نکلتی ہے کہ واقعہ کا تعلق حضور سے ہے اور آپ کو اس بات پر متنبہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کھوٹی ہوئی بیٹروں کی تلاش میں بعض اوقات اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ گلے کی بیٹروں کی دیکھ بھال میں کوتاہی ہو جاتی ہے۔

پہلے کڑے میں خطاب کے نہ ہونے سے قاری کے ذہن میں یہ سوال تو پیدا ہوتا ہے کہ معلوم کرے کہ کس کا واقعہ بیان ہو رہا ہے لیکن چونکہ مخاطب واضح نہیں ہے اس وجہ سے اس کو اپنی ذات سے متعلق کوئی پریشانی پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ حضور کے اندر بھی واقعہ سے متعلق سوال تو فوراً پیدا ہوا ہو گا لیکن خطاب چونکہ براہ راست نہیں تھا اس وجہ سے کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوئی ہوگی۔ برعکس اس کے اگر خطاب معین ہوتا تو یہ عقاب بہت سخت ہو جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں یہ بات متعین ہو جاتی کہ آپ پر عقاب ہوا اور وہ عقاب یہ ہے کہ آپ نے ایک نابینا کے آنے پر توش رعید اختیار فرمایا در آنحالیکہ واقعہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا اور آگے آ رہا ہے یہ نہیں ہے۔

آیات زیر بحث میں خطاب اس لیے واضح فرمایا ہے کہ یہاں وہ بات بھی بیان فرمادی گئی ہے جس پر عقاب ہوا ہے۔ یہ بات کسی فرض میں کوتاہی کی نوعیت کی نہیں بلکہ ادائے فرض میں حد مطلوب سے تجاوز کی نوعیت کی ہے۔ ہم یہ حقیقت جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ نفس کی خواہشوں کی یا سدا کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی

وہ اپنے رب کی رضا طلبی کے جوش میں اس حد سے آگے نکل جایا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شریعت دینے کے لیے طُور پر بلا یا تو اس کے لیے ایک خاص تاریخ بھی مقرر فرمادی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام فرطِ شوق میں مقررہ تاریخ کا انتظار نہ کر سکے بلکہ اس سے پہلے ہی طُور پر پہنچ گئے۔ ان کی اس عجلت پر گرفت ہوئی تو انھوں نے یہ مندرت پیش کی کہ اے رب، میں تیری رضا طلبی کے شوق میں جلدی چلا آیا ہوں۔ اس طرح کی لغزش ظاہر ہے کہ نہایت اعلیٰ جذبہ سے ہوتی ہے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام حق و عدل کی کامل میزان ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی لغزشوں پر بھی گرفت فرماتا ہے تاکہ میزان ہر پہلو سے درست رہے۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جس لغزش پر گرفت فرمائی گئی ہے وہ بھی اسی نوعیت کی ہے۔ سادات قریش کے ایمان لانے سے چونکہ آپ پر رے عرب کے لیے دعوت کی راہ کھلنے کی توقع رکھتے تھے اس وجہ سے اس کام میں آپ کا انہماک اس قدر بڑھ گیا کہ نہ آپ کو اپنے ذاتی آرام کی کوئی فکر رہی، نہ اس امر کا کوئی خیال رہا کہ یہ لوگ آپ کی ذات اور آپ کی دعوت کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس انہماک سے یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا کہ جو غریب مسلمان ایمان لائے ہیں ان کی تربیت کا نذر داری آپ پر عائد ہوتی ہے اس کو ادا کرنے کے لیے بھی آپ خشک ہی سے کچھ دقت نکال سکیں گے۔ اس صورت حال پر قرآن نے جگہ جگہ آپ کو نہایت محبت آمیز انداز میں ٹوکا اور آگاہ فرمایا ہے کہ آپ نے قریش کے معاملے میں اس سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اٹھالی ہے جتنی اللہ نے آپ پر ڈالی ہے۔ آپ ان کے پیچھے اتنے ہلکان نہ ہوں۔ آپ پر اللہ کی بات پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی وہ آپ نے پہنچا دی، اب مزید ان کی ناز برداری کی ضرورت نہیں ہے۔ انہی حالات کے اندر عبداللہ بن ام مکتوم کا یہ واقعہ پیش آیا جس نے گویا اس بات میں ایک بالکل فیصلہ کن سورہ نازل کر دی۔ اس تمہید کی روشنی میں آیات زیر بحث ادا گئے کی آیات پر غور کیجیے۔

دَمَا يَذُرِيكَ لَعَلَّه يَنْزِي - یعنی تم پر اس نابینا کا آنا اس اندیشہ سے گراں گزرا کہ شاید اس کے آجانے سے ان سادات کے پندار کو چوٹ لگے اور وہ بدک جائیں حالانکہ ہر سکتا ہے کہ تم ان کی ناز برداری میں ایک سچے طالب کو نظر انداز کر دو لیکن یہ پھر بھی نہیں تو ایسے ناقدوں کے پیچھے اپنے ایک سزاوار تربیت ساتھی کی حق تلفی کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول کا اصل مقصد لوگوں کا تزکیہ ہے۔ جو لوگ اس کے پاس تزکیہ کے رسول کے توجہ کے اسٹی متی طالب بن کر آئیں اس کی کوجہ و دلداری کے اصل حق دار وہی ہیں۔ دوسرے لوگ، خواہ بظاہر کتنی ہی اہمیت رکھتے والے ہوں، ان میں اگر اصلاح و تربیت کی طلب نہیں ہے تو رسول کے مقصد کے اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

یہاں ایک سچے طالب کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ طالب تزکیہ ہوتا ہے۔ سچے طالب کی دو صفتیں دوسری یہ کہ وہ یاد دہانی سے فائدہ اٹھانے والا ہوتا ہے۔

یہ درحقیقت تربیت گاہ نبوی کے سچے شرکاء کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ ان میں بالعموم دو طرح کے لوگ ہوتے۔ ایک وہ جن کے سامنے اپنی اصلاح و تربیت سے متعلق کوئی سوال ہوتا اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آتے، دوسرے وہ جن کے سامنے اگرچہ کوئی خاص سوال تو نہ ہوتا لیکن وہ مجلس میں حاضر ہوتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بطور خود یا کسی سائل کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمائیں اس سے بہرہ مند ہوں۔ یہاں نَعَلَهُ يَتَذَكَّرُ سے پہلی قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے اور يَتَذَكَّرُ كَوْنَهُ فَتَنْفَعُهُ الذِّكْرُ کے الفاظ سے دوسری قسم کے لوگوں کی طرف۔ یہ دونوں ہی راہیں طلب علم کی ہیں اور مقصود ان دونوں کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ جس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آنا ہو وہ انہی میں سے کسی ایک مقصد کو سامنے رکھ کر آئے اور وہی پیغمبر کے التفات کے حق دار ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی ناز برداری کے خواہاں ہیں ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور اپنے انجام کا انتظار کریں۔

أَمَّا مَنِ اسْتَعْنَىٰ لَا نَأْتِ لَكَ تَصَدَّىٰ ۖ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَدْرِكِي ۖ وَآ مَا مَرِيٓتُ
جَاءَكَ يَسْعَىٰ ۖ وَهُوَ يَفْشَىٰ ۖ نَأْتِ عَنْهُ تَكْفَىٰ (۵-۱۰)

یہ وہ اصل تفسیر ہے جو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائی گئی کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ جو اپنی اصلاح کے طالب بن کر آئیں اور ان کے اندر خدا کے حضور پیشی کا خوف ہو وہ آپ کی توجہ کے اصل مستحق قرار پائیں لیکن ہر یہ رہا ہے کہ جو بے پروا دے نیاز ہیں آپ ان کو دعوت فیض کے لیے تو اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں حالانکہ وہ اگر اپنی اصلاح نہیں چاہتے تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ پر اصل ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو ذوق و شوق سے آپ کے پاس آتے ہیں لیکن آپ ان سے غفلت برتتے ہیں۔

نَفْسَدَىٰ دہ اصل تَصَدَّىٰ ہے جو صَدَد کے مادہ سے ہے جس کے معنی متوازی اور مقابل کے ہیں۔ اس میں جو تغیر ہوا ہے وہ عربیت کے قاعدے کے مطابق ہوا ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو بے نیازی برتتے ہیں ان سے تو آپ متعرض ہوتے اور ان کو پر جانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ بوجہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر نہیں ڈالا ہے۔

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَدْرِكِي یعنی آپ پر اصل ذمہ داری انذار و بلاغ کی تھی، وہ کر چکنے کے بعد آپ ان سے بری الذمہ ہوئے۔ یہ ذمہ داری آپ پر نہیں ہے کہ آپ انہیں لازماً مومن و مسلم بھی بنا دیں۔ یہ مضمون سچے کی سہولتوں میں مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور ہر جگہ اس کا مقصود

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری سے زیادہ بوجھ اپنے اوپر نہ اٹھائیں اور اپنے کو غیر ضروری مشقت میں نہ ڈالیں۔ اگر یہ محروم القسمت لوگ اپنی اصلاح نہیں چاہتے تو ان کو ان کی تقدیر کے حوالہ کریں۔

جَاءَكَ يَسْعَىٰ يَسْعَىٰ، کا اصل مفہوم کسی کام کو ذوق و شوق اور سرگرمی و مستعدی سے کرنا ہے۔ دوڑنا اس کے لیے لازم نہیں ہے۔ فَاسْعُوا لِي ذِكْرًا لِلَّهِ کے معنی ہوں گے پس اللہ کے ذکر کی طرف سرگرمی اور مستعدی سے لپکو۔ آیت میں یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے یعنی جو لوگ آپ کے پاس نہایت ذوق و شوق سے اس طرح آتے ہیں جس طرح تیشہ چستہ کی طرف بڑھتا ہے۔

وَهُوَ يَحْشَىٰ، یہ مقابل میں ہے اَمَّا مَنِ اسْتَعْجَلَكَ، یعنی ایک تو وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کی مطلوبات و مرغوبات میں اس طرح کھوئے ہوئے ہیں کہ انھیں کبھی یہ فکر ستمانی ہی نہیں کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے اور اس کے لیے بھی کوئی تیاری ضروری ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنے اندر آخرت کی پیشی کا خوف رکھتے ہیں۔ اسی گروہ سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کی باتیں سننے والے ان کو حوزہ جاں بنائے نہ کہ پہلے گروہ سے، لیکن آپ کا حال یہ ہے کہ آپ پتھروں میں جو تک لگانے کے لیے تو رات دن سرگرم ہیں لیکن جن کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت ہے ان کی طرف پوری توجہ کرنے کی فرصت آپ کو نہیں ملتی۔

ان آیات سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوئیں:

ایک یہ کہ ان میں بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو عتاب ہے اس کا اصل رُخ آپ کی طرف نہیں بلکہ قریش کے ان فاجر لیڈروں کی طرف ہے جن سے کسی خیر کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اس وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ آپ ان سے صرف نظر کر کے اپنی ساری توجہ کامرکز ان غریبوں کو بنائیں جو اسلام لا چکے تھے اور آپ کی تعلیم و تربیت کے اصل حقدار تھے۔

ان آیات
کی تعلیم

دوسری یہ کہ حضور کو کسی ضمن کی ادائیگی میں کسی کوتاہی پر نہیں ٹوکا گیا ہے بلکہ اس بات پر ٹوکا گیا ہے کہ آپ نے اس سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اٹھالی ہے جتنی اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے۔ گویا یہ اسی طرح کا پر محبت و جاں نواز عتاب ہے جو لَمَّا كَفَرَ بَكَ بَاغٍ لِّنَفْسِكَ إِلَّا لِيَكُوْنُوا مُؤْمِنِينَ (الشعراء: ۲۶-۳۰) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں گزر چکا ہے۔

تیسری یہ کہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ اسلام کی اصل دولت وہ غریب ہیں جن کے اندر خدا کی خشیت ہے نہ کہ وہ امیر جن کے سینے خدا کی خشیت سے خالی ہیں۔ اس وجہ

لہ معلوم ہوتا ہے تم اپنے آپ کو ان کے پیچھے ہلاک کر کے رہو گے کہ وہ مومن نہیں بن رہے ہیں۔

سے آپ اپنی توجہ کا اصل مرکز انہی کو بنائیں جو اہل ہیں۔ ان کے پیچھے اپنا وقت نہ ضائع کریں جن کے اندر خیر کی کوئی رقم باقی نہیں رہی ہے۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورہ عبس میں اس عقاب کے رُخ کو ایک تمثیل سے سمجھایا ہے، جو نہایت حقیقت افروز ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اس عقاب کی
ایک حقیقت افروز
تمثیل

”اس کو ایک مثالی سے سمجھو۔ فرض کرو ایک نہایت منعقد اور فرض شناس چرواہا ہے۔ اس کے گلے کی کوئی فرجہ بھیڑ گلے سے الگ ہو کر کھو جاتی ہے۔ چرواہا اس کی تلاش میں نکلتا ہے ہر قدم پر اس کی گھر کے نشانات ملتے جا رہے ہیں۔ جنگل کے کسی گوشے سے اس کی آواز بھی آرہی ہے۔ اس طرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصل گلے سے کچھ دیر کے لیے غافل ہو جاتا ہے۔ جب وہ واپس لوٹتا ہے تو آقا اس کو ملامت کرتا ہے کہ تم لوہے کے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیرانی بھیڑ کے پیچھے بلکان ہوئے۔ اس کو چھوڑ دیتے، بھیرٹیا کھا جاتا، وہ اسی کے لائق تھی۔ تاہذا، اس میں عقاب کس پر ہوا؟ چرواہے پر یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ بالکل یہی صورتِ معاملہ یہاں بھی ہے۔ عقاب کا رُخ بظاہر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ضرور ہے لیکن غصہ کا سارا زور منکرین و مخالفین پر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو اس عقاب کے اندر نہایت دل نواز شفقتیں مضمیں“

كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ (۱۱-۱۲)

”کَلَّا“ یعنی اس طرح کے ناقدروں سے اس طرح چھٹنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ یہ قرآن میں ایک یاد دہانی ہے۔ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور جس کا جی نہ چاہے وہ اس انجام سے دوچار ہو گئے کے لیے تیار رہے جس سے یہ لوگوں کو آگاہ کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر پر ذمہ داری لوگوں تک اس یاد دہانی کو پہنچا دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اس کو اتار بھی دے۔ اس پر ذمہ داری انذار کی ہے نہ کہ ایک ایک کی ناز برداری کی!

رَأْنَهَا میں ضمیر کا مرجع ’ذُكْرَى‘ ہے جو آیت ۱۱ میں ہے۔ اور ’ذَكَّرْهُ‘ میں بھی مرجع وہی ہے لیکن یہاں لحاظ معنی کا ہے اس وجہ سے ضمیر مذکر آئی۔ چونکہ ’ذُكْرَى‘ اور ’تَذَكَّرْهُ‘ دونوں سے مراد قرآن ہی ہے اس وجہ سے یہاں ضمیر مذکر لاکران کے اصل مفہوم پر روشنی ڈالی دی۔ اس کی مثالیں سمجھے گزر چکی ہیں۔ اس سے وہ حقیقت واضح ہو گئی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ یہاں اگر حضور پر کوئی عقاب ہے بھی تو اس کی نوعیت عقابِ محبت کی ہے کہ آپ نے اپنے اوپر وہ بوجھ کیوں اٹھایا ہے جو آپ کے رب نے آپ پر نہیں ڈالا۔

فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ کے بعد کلام کا ایک حصہ حذف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی:

کہ جس کا جی چاہے اس یاد دہانی سے فائدہ اٹھائے، جس کا جی چاہے وہ بہرا بنا رہے۔ دوسرے مقام پر یہی بات یوں فرمائی ہے: فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (الکھف - ۱۸:۱۹) (پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے)۔

فِي صُحُفٍ مُّسَكَّرَةٍ ۙ مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِأَيْدِي سَفِيحَةٍ ۙ كِتَابٍ مُّبِينٍ (۱۳-۱۴)

اد پر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متکبرین سے اعراض اور بے پروائی برتنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہارے شایان شان بات یہ نہیں ہے کہ ان مغزوروں کے آگے تم اپنے آپ کو زیادہ جھکاؤ اسی طرح یہ کلام بھی، جو تم ان کو سنا رہے ہو، ایسی چیز نہیں ہے جو منت و سماجت کے ساتھ پیش کی جائے بلکہ یہ نہایت ہی اشرف و نہایت ہی بلند اور نہایت ہی پاکیزہ و برتر چیز ہے۔ یہ کوئی ناقص جنس نہیں ہے کہ تمہیں یہ نکر کرنی پڑے کہ کسی نہ کسی طرح یہ ایک ہی جائے اگرچہ اس کی خاطر تمہیں خریداروں کی خوش آمدی کرنی پڑے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ محفوظ کے لعل و گہر ہیں جو تم مفت لٹا رہے ہو۔ اگر یہ لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ اپنے ہی کو ابدی خسارے میں مبتلا کر رہے ہیں۔

فِي صُحُفٍ مُّسَكَّرَةٍ ۙ یہ اس کلام کی عالی نسی اور عالی مقامی کی تعریف ہے۔ 'فِي صُحُفٍ مُّبِينَةٍ' ہوا 'فِي صُحُفٍ' ہے۔ یہاں مبتدا، کہ حذف کر دیا ہے۔ صفات مابعد کے بیان میں مبتدا کا حذف عربیت میں معروف ہے۔

'صُحُفٍ مُّسَكَّرَةٍ' لکھے ہوئے ورق کو کہتے ہیں۔ جمع کی صورت میں یہ بعض اوقات کتاب کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں اس سے اشارہ لوج محفوظ کی طرف ہے۔ 'مُسَكَّرَةٍ' یعنی وہ ایک عزیز، گراں مایہ اور قیمتی خزانہ ہے جس کی حفاظت اللہ کے فرشتے نہایت اہتمام سے کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس تک ہر ایک کی رسائی ہے اور نہ ہر ایک اس کا اہل ہے کہ اس میں سے کچھ لے یا پاسکے بلکہ یہ اللہ ہی ہے کہ اس میں سے جس کو چاہتا ہے کچھ بخشتا ہے اور اسی نے تمہیں اس خزانے سے بخشا ہے تو اس نعمت سے اتنی ہی کو بہرہ مند کرو جو اس کے اہل ہیں۔ نا اہلوں کے آگے ان موتیوں کو نہ ڈالو۔ یہ بات انجیل میں بھی نہایت مؤثر تمثیل کی صورت میں آئی ہے اور ہم کسی مؤردوں مقام میں اس کو نقل کر آئے ہیں۔

'مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ' یہ دونوں صفتیں بھی اس کے مکرم ہونے کے پہلو ہی کی وضاحت کے لیے آئی ہیں۔ صفت 'مَرْفُوعَةٍ' معنی اور درجہ دونوں قسم کی بلندیوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے: وَرَاقَةٌ فِي أُمِّ الْقَيْسِ لِذِي النُّفُورِ (۴۲:۴۳)

(اور یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے، نہایت بلند اور پر حکمت)۔

‘مُطَهَّرَةٌ’ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ قرآن مجید شیاطین اور ارواح نجیثہ کی دست رس سے بالکل محفوظ ہے۔ مثلاً فرمایا ہے: **بِقِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝ لَا يَسْمَعُ إِلَّا الظُّهْرُونَ** (الواقعة - ۵۶: ۷۹ - ۷۸) (وہ ایک محفوظ کتاب میں ہے جس تک حرف پاکیزہ یا تھولہ ہی کی رسائی ہے)۔

‘يَا بُيُوتِي سَفَرَةٌ ۝ كِرَامٍ بَرَدَةٌ’ - یہ ان ملائکہ کی صفت بیان ہو رہی ہے جن کی امانت میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب عزیز کو محفوظ فرمایا ہے۔ اور **لَا يَسْمَعُ إِلَّا الظُّهْرُونَ** (مالین کی والی آیت کا ہم نے حوالہ دیا ہے۔ اس میں جو بات منفی پہلو سے فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں مثبت پہلو سے فرمائی گئی ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ اس کتاب عزیز تک ارواح نجیثہ کی رسائی نہیں ہے بلکہ یہ ان پاک فرشتوں کی تحویل میں ہے جو نہایت باعزت اور نہایت باوقار ہیں۔

‘سَفَرَةٌ’ جمع ہے ‘سَافِرٌ’ کی جس کے معنی قاری و کاتب کے ہیں۔ ‘سَفَرٌ’ پڑھنے اور لکھنے دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ اس کے اشتقاق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی ہیں تو لکھنے کے لیکن پڑھنے اور بیان کرنے کے مفہوم میں یہ وسیع ہو گیا ہے۔

لفظ ‘کِرَامٍ’ میں ان کی عالی مقامی اور بلند کرداری کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایسے بلند مرتبہ اور معزز ہیں کہ ان سے کسی خیانت کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ نہ وہ اس میں خود کمی بیشی کر سکتے، نہ یہ امکان ہے کہ جنات و شیاطین کو اس تک رسائی کا کوئی موقع دیں۔

‘بَرَدَةٌ’ جمع ہے ‘بَرْدٌ’ کہتے ہیں فرماں بردار، باوقار اور اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والے کو۔ یہ صفت ان کی امانت داری کے وصف کو مزید نمایاں کرنے کے لیے آئی ہے مثلاً فرمایا ہے: **نُزِّلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (الشعراء - ۶: ۱۹۳، ۲۷)** (یہ کلام جبریل امین کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے)۔ دوسرے مقام میں اس کی مزید وضاحت ہے: **إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ (التكوير - ۸۱: ۱۹-۲۱)** (یہ کلام ایک باعزت رسول کے واسطے سے القاء ہوا ہے۔ وہ بڑی قوت والا اور عرش دارے کے حضور میں نہایت مقرب ہے۔ اس کی بات مانی جاتی ہے۔ مزید برآں وہ نہایت معتد ہے)۔

قرآن اور اس کے محافظین کی ان صفات کے ذکر سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے منت و سماجت کے ساتھ پیش کی جائے بلکہ جس عظمت و شان کا وہ کلام ہے اسی وقار و خودداری کے ساتھ اس کی دعوت دی جائے اور جس طرح کے باوقار ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اور اس کو نازل کرنے پر مامور فرمایا ہے چلیے کہ اللہ کا رسول اور اس کے ساتھی بھی اس کی دعوت و تبلیغ میں اسی

کردار کا مظاہرہ کریں۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ وحی الہی کے اخذ و تلقین کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس ذات کا انتخاب فرمایا اور پھر جن لوگوں پر اس کی حفاظت، وصیانت اور تحریروں کی ذمہ داری ڈالی وہ کس کردار اور کن صفات کے لوگ تھے اور انہوں نے کس دیانت و امانت کے ساتھ اپنے اس فرض کو انجام دیا۔ گویا جن صفات کے علاوہ کہ کو اس خدمت پر آسمانوں میں مامور فرمایا گیا انہی صفات کے انسانوں کو اس زمین پر اس کے محل و نقل کے لیے منتخب فرمایا گیا۔

قَتَلَ الْإِنْسَانَ مَا أَكْفَرَهُ (۱۷)

اگرچہ لفظ الْإِنْسَانُ عام ہے لیکن کلام کا رخ انہی مستکبرین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ ہم سمجھے مناسب مواقع پر زبان کے اس اسلوب کی طرف توجہ دلا چکے ہیں کہ بعض مرتبہ کلام کا رخ ہوتا تو کسی خاص شخص یا کسی مخصوص گروہ ہی کی طرف ہے لیکن بات ان سے منہ پھیر کر عام عینے سے کہہ دی جاتی ہے جس سے متکلم کی بے زاری کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ فرمایا کہ یہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے! غارت ہوا کتنا ناشکر! اس کی بددماغی کا حال یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کو اللہ کا کلام اور پیغام بھی سنایا جائے تو اس کے آگے جھک کر اور نیاز مند بن کر سنایا جائے!

انسان کی
بددماغی پر
اظہار و انکسار

دراز دستی ایس کو تہ آستیناں میں!

مَا أَكْفَرَهُ، کا اسلوب اظہار تعجب اور اظہار نفرت دونوں کا حامل ہے۔

مِنْ آتِي شَيْءٍ خَلَقَهُ ۖ مِنْ نَفْثَةٍ ۖ خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ ۖ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسْرَعُهُ
ثُمَّ آمَاتَهُ خَافِبَهُ ۖ ثُمَّ إِذَا سَاءَ أَشْجَهُ (۱۸-۲۲)

یہ ان مغروروں کے کبر و غرور پر ضرب لگاتی ہے لیکن مطالب کی ترتیب اس طرح ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں انسان کی خلقت، مادہ خلقت، مراحل خلقت، وسائل معیشت، غرض زندگی، موت، قبر سے نکل کر حشر و نشر تک ساری باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ ان پر اپنے غرور کی بے بنیادی بھی واضح ہو جائے اور وہ خود اپنی زندگی کے آئینہ میں اس جزاء پر تڑا کو بھی دیکھ لیں جس کی خبر قرآن ان کو دے رہا ہے۔

مِنْ آتِي شَيْءٍ خَلَقَهُ، یہ سوال تحقیق کے لیے بھی ہے اور زندگی بعد الموت کی طرف توجہ دلانے کے لیے بھی۔ ان متبرک دین کو زعم بھتا کہ جس طرح اس دنیا میں وہ باعزت اور صاحب سیادت و قیادت ہیں اسی طرح آخرت ہوئی تو وہاں بھی ان کے لیے شایان شان مراتب ہوں گے۔ اس زعم کے سبب سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انداز ان کے دلوں پر بڑا شاق گزرتا تھا کہ

یہ ہم کو تو جہنم میں جھونکے جانے کے ڈراوے سنا رہے ہیں اور ان فخر فقیروں کو جنت اور ابدی بادشاہی کی بشارت دے رہے ہیں جو ہمیشہ سے ہماری جوتیاں سیدھی کرتے آئے ہیں اور جن کو اپنے پہلو میں بٹھانا بھی ہم نے گوارا نہ کیا۔ ان کے اس زعم پر قرآن نے ان الفاظ میں ضرب لگائی ہے:

فَسَالِ السَّدِيدِۦنَ كَفَرُوا قَبْلَكَ

مُطِيعِينَ ۗ عَنِ السَّبِيۦنَ دُعُوۡنِ

السَّكٰلِۦ عَزِيۡنَ ۗ اَيُّطٰعُ كُلُّ مَرْۡيُۡ

مِنْهُمۡ اَنْ يُّدَّ حَلَّ جَنَّةٍ نَّعِيۡمٍ ۗ

كُلًّا طٰ اَنَا خَلَقْتُهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوۡنَ ۗ

(المعارج - ۲۰، ۲۱، ۲۲ - ۳۹)

ان آیات کا سیاق و سباق اور اس کی تفسیر تدبر قرآن کی روشنی میں سمجھ لیجیے۔ یعنی نجس پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوئی مخلوق کو اپنی برتری اور پاک دامنی کا یہ غرہ فریب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو پیدائشی حق دار جنت سمجھ بیٹھے۔

اسی طرح قرآن نے جگہ جگہ انسان کی خلقت اور اس کے مادہ خلقت سے قیامت پر اس پہلو سے استدلال کیا ہے کہ جو خدا پانی کی ایک حقیر بوند کو انسان بنا سکتا ہے اس کے لیے اس کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے! یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے بار بار بیان ہوا ہے، ہم صرف چند جامع آیات یہاں نقل کرتے ہیں:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنۡسَانَ مِنْ سُلۡلٰتٍ

مِّنۡ طِيۡنٍ ۗ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نَظْفًا

فِيۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ۗ ثُمَّ خَلَقْنَا

النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ

مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا

فَنَكَّسُوۡنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا

خَلْقًا اٰخَرَ طَبَّارًا ۗ اَللّٰهُ اَعۡزَمُ

الۡمُخَلِقِيۡنَ ۗ ثُمَّ اَنۡتَكُمۡ بَعۡدَ

ذٰلِكَ لَمَيۡتُوۡنَ ۗ ثُمَّ اَنۡتَكُمۡ يَوۡمَ

الۡقِيٰمَةِ تَبَعۡثُوۡنَ ۗ

(المؤمنون - ۲۲، ۲۳، ۲۴ - ۱۴)

اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔

پھر ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند کی شکل میں ایک

مخفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے بوند کو

ایک جنین کی شکل دی پھر اس جنین کو گوشت

کا ایک لوتھڑا بنایا اور اس لوتھڑے کے اندر

ٹڈیاں پیدا کیں اور ٹڈیوں کو گوشت کا جامہ

پہنایا پھر اس کو ایک بالکل ہی دوسری شکل

دے دی۔ پس بڑا ہی بافیض و بابرکت ہے

اللہ، بہترین خالق! پھر اس کے بعد لازماً

تم مرنے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے

بھی جاؤ گے۔

مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ سَوَال کا جواب چونکہ بالکل واضح تھا جس سے کسی کے لیے بھی انکار کی گنجائش نہیں تھی اس وجہ سے جواب خود ہی دے دیا کہ پانی کی ایک بوند سے انسان کو پیدا کیا۔ اس پانی کی صفت قرآن کے دوسرے مقام میں مہین آئی ہے جس کے معنی حقیر و ذلیل کے ہیں۔ یعنی نہ اپنی کیت کے اعتبار سے کوئی بڑی چیز نہ قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی گہر گراں مایہ تو ایسے شخص قطرے سے وجود میں آنے والے انسان کو زیادہ اترا تا کس طرح زیب دیتا ہے!

خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ تحقیق کے مضمون کے بعد کلام کا رخ اس تقدیر، تدبیر اور تیسیر کے بیان کی طرف مڑ گیا ہے جو انسان کی خلقت اور اس کی زندگی کے احوال و مراحل میں نمایاں ہے اور جو اس بات کی ناقابل انکار شہادت ہے کہ قدرت جس قطرے کو گہر بنانے پر اپنے عجائب تصرف کی اتنی شانیں دکھائی ہے وہ کوئی عبت اور بے مقصد چیز نہیں ہو سکتی بلکہ لازم ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں وہ اس کی قدر و قیمت کو پرکھے، اس کے خیر و شر کو تو لے اور پھر جس کو اپنی میزان میں با وزن پائے اس کو چھانٹ لے اور جس کو ناکارہ اور بے قیمت پائے اس کو خس و خاشاک کی طرح نور میں جھونک دے۔

فَقَدَرَهُ میں اشارہ ان منازل و مراحل کی طرف ہے جو انسان کی تدریجی تشکیل میں نمایاں ہیں۔ جس طرح چاند کے عروج و محاق کی منازل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لفظ آیا ہے، مثلاً وَأَنْقَسَرَ قَدْرُهُ مَنَازِلَ رَّيْسٍ - ۳۶ : ۳۹) اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں) اسی طرح انسان کے تدریجی نشوونما اور اس کے بچپن، جوانی اور پھر زوال و فنا کی طرف توجہ دلانے کے لیے یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ اور پر سورہ مومن کی آیات کا حوالہ گزرا ہے اس میں بھی یہ مضمون ہے اور یہاں آگے کی آیات میں بھی اس کے بعض پہلو واضح فرمائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تدریج و تقدیر خدا کی قدرت و حکمت اور اس اہتمام پر دلیل ہے جو انسان کی تخلیق میں نمایاں ہے اور یہ قدرت اور یہ اہتمام اس امر کی دلیل ہے کہ انسان کوئی عبت چیز نہیں ہے بلکہ اس کی خلقت ایک عظیم غایت کے لیے ہے جس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد اٹھایا جائے، اس کا حساب ہو، اس کو جزایا سزا ملے۔ ساتھ ہی انسان کی تخلیق میں خدا کی جو قدرت نمایاں ہے وہ اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ذرا بھی مستبعد نہیں ہے۔

تیسرا پتہ
وَمَا يَسْتَوِي السَّمْعُ وَالْبَصَرُ وَالْأَفْئِدَةُ وَالْأَبْصَارُ
کے بطنی مادہ سے برآمد ہونے کے لیے خود عورت اور بچہ کے نظام جسم میں ودیعت فرمادی ہے اور جو دو بطنوں کی مدد کے لیے عین وقت پر نمودار ہوتی ہے۔ یہ بات غلط نہیں ہے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ قدرتی انتظام نہ ہو تو کوئی دوسری تدبیر اس کا بدل نہیں ہے بلکہ زچہ و بچہ دونوں کے گھٹ کو مرنے کا اندیشہ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک تیسیر کے مفہوم کو اس قدر محدود کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بچہ جس طرح بطنی مادہ

کے اندر قدرت ہی کی تدبیر و تیسیر سے نشوونما پاتا ہے اسی طرح مہد سے لحد تک قدرت ہی کی تیسیر اور رہنمائی سے وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز طے کرتا ہے۔ یہ خدا ہی کی تیسیر ہے کہ بچے کے پیدا ہونے کے بعد اس کی ماں کی چھاتیوں میں اس کے تغذیہ کے لیے دودھ اترتا ہے اور اس کو قدرت کی طرف سے جبلی طور پر یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ماں کی چھاتیوں کو چوسے۔ اسی طرح جوانی کے دور میں، وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں جو سرگرمیاں دکھاتا اور جو فتوحات حاصل کرتا ہے ان میں بھی وہ خدا ہی کے بخشے ہوئے اعضاء و اسلحہ، خدا ہی کی عطا کردہ عقل اور خدا ہی کی بخشی ہوئی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سورہ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی شان یہ بتائی ہے کہ **الَّذِي خَلَقَ فَسُوًى مِثْلًا وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ (الاعلیٰ - ۸۷ : ۲ - ۳)** (جس نے خاک بنا یا اور اس کے ٹوک پک سنوارے اور جس نے صلاحیتیں ودیعت کیں اور پھر ان کے استعمال کی راہ دکھائی)۔

یہی حال انفسی اور اخلاقی عالم میں بھی ہے۔ سورہ شمس میں فرمایا ہے: **وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَنهَمَّا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ۚ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (المشمس - ۹۱ : ۷ - ۱۰)** (شاہد ہے نفس اور اس کی ترکیب، پس اس کو الہام کی اس کی بدی اور نیکی تو جس نے اس کو پاک رکھا اس نے فلاح پائی اور جس نے گندا کیا وہ نامراد ہوا) غرض زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ روحانی ہو یا مادی اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کی راہ ہموار کی۔ اگر وہ اس راہ پر چلے تو وہ کبھی ٹھوکر نہ کھائے لیکن اپنے اختیار کے سوا استعمال سے وہ سیدھی راہ کے بجائے ٹیڑھی راہ اختیار کر لیتا ہے جو اس کو کسی ہلاکت کے کھڈ میں لے جا پھینکتی ہے۔

لَكُمْ أَمْثَلُهُ فَاقْبَرُوا ۚ یہ زندگی کے آخری مرحلہ کی طرف اشارہ ہے کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو موت دیتا اور دفن کرنا ہے۔ ہر پیدا ہونے والے کے لیے پیدا ہونے کے بعد سب سے زیادہ یقینی چیز موت ہی ہے۔ قدرت نے اس کو ایسے ضابطوں کے اندر جکڑ رکھا ہے کہ موت سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں ہے۔ اس کی کند بالکل بے خطا ہے۔

اقْبَرُوا کے معنی کسی کو قبر میں رکھوانا یا دفن کرنا ہے۔ اس لفظ میں ایک لطیف اشارہ اس آخروی مرحلہ بات کی طرف بھی ہے کہ جو مرنے سے وہ فنا نہیں ہو جاتا بلکہ قدرت اس کو زمین کی تحویل میں دے دیتی ہے جو شے تحویل میں دی جاتی ہے وہ لازماً ایک دن واپس لی جاتی ہے چنانچہ جب وقت آئے گا اللہ تعالیٰ اس امانت کو زمین سے واپس لے گا۔

لُعَاظُ الْحَمَامِ وَالنَّسْرَةُ۔ **النَّسْرَةُ** کے معنی کھولنے، پھیلانے، پھینٹنے اور از سر نو اٹھا کھڑا کرنے کے ہیں۔ یعنی جب وہ پا ہے گا اس کو اٹھا کھڑا کرے گا۔ اس کام میں اس کو ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ جب پانی کی ایک بلوند کو رحم مادر کے اندر اس نے ایک انسان کی شکل دے دی اور

اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو اسی انسان کو زمین میں دفن کرانے کے بعد اس سے
 اذہم نو براہد کر لینا کیوں محال ہو جائے گا!
 كَلَّا لَسْنَا بِقَاضٍ مَّا اَمْرًا (۲۳)

یہ آیت اوپر والی آیت قَتَلَ الْاِنْسَانَ مَا كَفَرَ کے بالکل متنازی آیت ہے جس طرح اس میں
 ہٹ دھرموں کی ہٹ دھرمی پر اظہارِ تعجب اور پھر ان کے اپنے وجود سے اس قیامت پر دلیل ہے
 جس کو وہ ناکھن سمجھ رہے تھے اسی طرح اس آیت میں ان کی کج فہمی پر بانڈازِ زجرِ ملامت اور اس کے
 بعد قیامت اور جزا و سزا پر اس اہتمامِ ربوبیت سے دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے گرد و پیش
 میں پھیلا رکھا ہے اور جو زبانِ حال سے یہ شہادت دے رہا ہے کہ جس انسان کے لیے رب کریم نے یہ
 خوانِ نعمت بچھایا ہے وہ غیر مستول نہیں چھوڑا بلکہ اس کے لیے لازماً ایک روز حساب آنے والا ہے۔
 لَسْنَا بِقَاضٍ مَّا اَمْرًا کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک سمجھانے اور دلائل پیش
 کرنے کا تعلق ہے اس میں اب کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے لیکن ان ضدیوں کی ضد اور مکاربت کا وہی حال ہے
 جو پہلے تھا۔ جس دن کے لیے تیاری کی ان کو ہدایت کی جا رہی ہے اب بھی وہ اس سے بے پروا ہیں۔

مَّا اَمْرًا میں وہ تمام احکام و ادا بھی داخل ہیں جو فطرت کی بدیہیات میں سے ہیں اور وہ احکام
 بھی جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے۔ بدیہیات
 فطرت کے امر الہی ہونے کی وضاحت ہم آیت فَاتَّوَهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكَ اللهُ بِالْبَقْعَةِ (۲۲:۲۳) کے تحت کر چکے ہیں۔
 فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (۲۴)

غور کرنے والے
 کے لیے دلائل کی
 کی نہیں ہے۔
 یعنی اگر وہ دلیل ان کی سمجھ میں نہیں آئی جو بیان ہوئی تو دلیلوں کی کمی نہیں ہے۔ انسان اپنی غذا ہی
 کے مسئلہ پر ذرا غور کی نگاہ ڈالے جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو پیدا کرتا
 پھر کس وسعت، کس تنوع اور ضروریات کی نوعیت کے لحاظ سے کتنی گونا گوں شکلوں میں اس کو پھیلا دیتا ہے
 مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اس پر غور کرے گا تو ضد کی بات اور ہے لیکن اس کی عقل میں فتور نہیں ہے تو وہ نہایت
 آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کو مرنے کے بعد زندہ کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جو بارش
 اس کی غذا کا ذریعہ ہے وہی براہِ اس کا مشاہدہ کراتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ
 ربوبیت کا یہ وسیع انتظام مستحکم ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہو۔ البتہ ان لازماً اس سے پرسش
 ہوتی ہے کہ اس نے ان نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ ہر حق کے ساتھ ذمہ داری کا لزوم ایک امر فطری ہے۔

اِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبَابًا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۲۵-۲۶)

غور کرنے کا
 طریقہ
 صرف غور کرنے کی دعوت ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ غور کی لائن بھی معین کر دی کیوں غور کرے
 فرمایا کہ یہ ہماری ہی قدرت و عنایت کا کرشمہ ہے کہ ہم اچھی طرح مینہ برساتے اور پھر زمین کے مسامات کو اس

میز سے میرا سب ہونے کے لیے اچھی طرح کھول دیتے ہیں۔ نہ آسمان سے پانی برسا نا کسی کے بس میں ہے اور زمین کے سمات کو کھولنا کسی کے امکان میں نہ آتا لیکہ انہی دونوں چیزوں پر زمین کی تمام فیض بخشی کا حصہ ہے یہی مضمون سورہ انبیاء میں یوں بیان ہوا ہے، اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتْ اَدْفًا فَفَتَقْنَاهُمَا (الانبیاء-۲۱:۳۰) آسمان اور زمین دونوں بند ہوتے ہیں پس ہم ان کو کھول دیتے ہیں۔

اوپر کے پیرے میں انسان کی خلقت کی جو نوعیت بیان ہوئی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیجئے تو دونوں دلیلوں کی مشابہت واضح ہوگی۔ وہاں بیان دلیل کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ بات اثبات امکان قیامت سے چلی پھر ربوبیت، مسئولیت اور جزاء و سزا تک پہنچتی ہے۔ یہاں بھی آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ استدلال کی ترتیب وہی ہے۔ پہلے ایک جامع بات نے امکان معاد کی تمہید استوار کر دی۔ اس کے بعد ربوبیت کے آثار کی طرف توجہ دلائی گئی اور پھر مسئولیت اور جزاء و سزا کو ایک بدیہی نتیجہ کے طور پر سامنے رکھ دیا گیا ہے۔

فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًا ۙ وَعَيْنًا ۙ وَقَضْبًا ۙ وَزَيْتُوْنَآ وَنَخْلًا ۙ وَحَدٰٓئِقٍ غُلَبًا ۙ
وَفَاكِهَةً ۙ وَاَبًا (۲۴-۳۱)

آسمان زمین یا باغاطر دیگر بارش اور زمین کے باہمی تفاعل سے اللہ تعالیٰ کی پروردگاری کی جو برکتیں اہل زمین کے لیے ظہور میں آتی ہیں یہ ان میں بعض ایسی نمایاں چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن سے قرآن کے قول مخاطب واقف بھی تھے اور جو انسان کی غذائی ضروریات میں بنیادی اہمیت رکھنے والی بھی ہیں۔

سب سے پہلے بعض ان چیزوں کی طرف توجہ دلائی جو زمین سے لگی ہوئی یا اس پر کھپی ہوئی پیدا ہوتی ہیں اور جن کو دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی، مثلاً غلہ، انگور اور ترکاریاں۔ عمدہ غذائی چیزوں میں بنیادی اہمیت رکھنے والا ہے۔ دوسری ساری چیزیں اس کے تحت ہیں۔ اس وجہ سے اس کا ذکر سب سے پہلے کیا، عمدہ کے بعد غذائی چیزوں میں دوسری اہمیت رکھنے والی چیز پھل ہے اور پھلوں میں راس الثمار کی حیثیت انگور کو حاصل ہے اس پہلو سے بطور نمونہ اس کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد ترکاریوں کا ذکر فرمایا جو زمین پر پھیلی ہوئی پیدا ہوتی اور غلہ کے ساتھ سالن کے طور پر کام آتی ہیں، بعض کچی حالت میں اور بعض پکا کر لفظ 'قضب' کا غالب استعمال اگرچہ انہی سبزیوں اور ترکاریوں کے لیے ہے جو کچی کھاٹی جاتی اور تیار سالن کے مکھ میں داخل ہیں لیکن عم سبزیوں اور ترکاریوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کے بعد بعض ان نعمتوں کا ذکر ہے جو فضا میں ابھرے ہوئے درختوں سے حاصل ہوتی ہیں اور جن کو دیکھنے کے لیے نگاہ اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بطور مثال ان میں سے زیتون اور کھجور کا ذکر فرمایا۔ زیتون کو روغن پیدا کرنے والی چیزوں میں جو اہمیت حاصل ہے وہ معلوم ہے۔ قرآن میں اس کے روغن کی غذائی اہمیت کا بھی ذکر ہے اور سورہ نور میں اس سے جلنے والے روغن چراغوں کی تمثیل بھی بیان ہوئی ہے۔

پھر کھجور کا ذکر ہے۔ کھجور اہل عرب کے لیے بیٹے وقت گوناگوں فوائد و برکات کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کے لیے غذا سے بھرپور میوہ بھی ہے اور ذخیرہ کیے جانے کے قابل نہایت پر منفعت نکتہ بھی۔ علاوہ ازیں اس سے وہ نہایت لذیذ مشروب بھی حاصل کرتے۔

وَحَدَّثَنَا عَلِيٌّ، خَاصٌّ خَاصِّ خِيزُولِ كَمَا ذَكَرْتُكَ بَعْدَ يَوْمِ بَاعُوهُنَّ كِي طَرَفِ اِشَارَةِ فَرَادِيَا۔ حَدَّثَنَا عَلِيٌّ كَهْرَ بُوْتَيْهِ بَاغٍ كُو كَهْتِي هِي۔ عُذْبٌ، جَمْعُ هَيْ اَعْلَبُ، كِي جِسِّ كَمَعْنِي مَوْطِي كَرْدَنِ دَلَسِي كِي هِي۔ لَكِنِ كَبِ يِه بَاغِ كِي صِفَتِ كِي طَوْرٍ پَرِ اَتِي تُو اَسَّ سِي مَقْصُودِ دَر رَخْتُو كِي شَا دَالِي كِي طَرَفِ اِشَارَةِ كَرْنَا هُوْتَا هِي۔ بَاغِ شَادَابِ هُو كَا تُو لَازِمًا دَر رَخْتُو كَا كِهِي اِذْ بَطْرَه جَائِي كَا اِدْرَانِ كِي اِدْرِكِ كَحْصِي بَاهِمِ دَر كَرْمَلِ كُو كَهْنِي هُو جَائِي كِي۔ دَوَا كِهِيَّةٌ دَا اَبٌ۔ يِه اَسَّ كُو عَامِ تَزْكُرْ دِيَا تَا كِه قَدْرَتِ كِي اَسَّ خُوَانِ كَرْمِ كَا دَا اِرْه اِنْسَانُو كِي سَا تَه اِن سِيَوَانَاتِ تَمَّا دَسِيْعِ هُو جَائِي سُو بِلَادِ اَسْطِ يَا بَالُو اَسْطِ اَسَّ كِي كَامِ اَتِي هِي۔

اوپر میوؤں میں سے صرف خاص خاص کا ذکر نام کی تصریح کے ساتھ ہوا تھا، یہاں لفظ فَاكِهِيَّةٌ استعمال کر کے تمام میوؤں کی طرف اشارہ فرما دیا، خواہ عرب میں پیدا ہوتے ہوں یا عجم میں، خواہ وہ اعلیٰ درجے کے ہوں یا ادنیٰ درجے کے اور خواہ وہ پرندوں ہی کے لیے مخصوص ہوں یا انسان بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہوں۔ علاوہ ازیں اوپر صرف انہی نعمتوں کا ذکر ہے جو انسانوں کو حاصل ہیں، دراصل ایک انسانوں کے ساتھ ان کی خدمت کرنے والے چوپائے بھی ہیں جن کا انسان محتاج بھی ہے اور جو اسی طرح پرورش کے حاجت مند ہیں جس طرح انسان ہے لیکن خاص ان کے لیے کسی چیز کا ذکر نہیں ہوا تھا۔ وہ کمی یہاں لفظ اَبٌ، کا اضافہ کر کے پوری کر دی۔

اَبٌ، كِي مَعْنِي نَبَاتِ اِدْر شَادَابِ كِه اَسَّ كِي هِي۔ چوپایوں کے کام آنے والی چیز تو وہ کبھی بھی ہے جو غلہ سے آگ کیا جاتا ہے لیکن وہ عام اور معمولی چیز ہے جب کہ یہاں موقع کسی ایسی چیز کے ذکر کا تھا جو ان کے لیے وہی درجہ رکھتی ہو جو درجہ انسانوں کے لیے فَاكِهِيَّةٌ كَا ہے۔ تازہ اور شاداب گھاس ان کے لیے عام بھی ہے اور ساتھ ہی ان کے وہ تمام میوؤں، سبزیوں اور ترکاریوں کا بہترین بدل بھی ہے جو انسان کو حاصل ہیں۔ لَفْظُ اَبٌ، پَرِ اَسَا ذَا اِم رَحْمَةِ اللّٰهِ عَلَيْهِ نِي اِپْنِي تَفْسِيْرِ سُوْرَةِ عَبَسَ فِي مَفْصَلِ بَحْثِ كَر كِي ثَابِتِ كِي بَا هِي كِي يِه لَفْظِ عَرَبِي كِي مَعْرُوفِ اَلْفَاظِ فِي سِي سِي نِي اِسَّ دَر جِي سِي بَعْضِ رُوَايَاتِ فِي يِه بَاتِ جُو نَقْلِ هُو تِي هِي كِي كِه حَضْرَتِ اِبُو بَكْرٍ صِدِيْقٌ اِدْر حَضْرَتِ عُمَرُ كُو اَسَّ كِي مَعْنِي كَا عِلْمِ نَهِيں تَهَا، كَسِي طَرِحِ صَحْحِ نَهِيں هِي۔ يِه رِي سِي زَوْدِي كِ اَسَا ذَا اِم رَحْمَةِ اللّٰهِ عَلَيْهِ كِي تَحْقِيْقِ نَهَائِيْتِ تَشْفِي بَخْشِ هِي۔ اِگَر كَسِي كُو اَسَّ كِي بَارِي سِي كُو تِي غَلْشِ هُو تُو دِه مَوْلَانَا كِي تَفْسِيْرِ سُوْرَةِ عَبَسَ كِي مَرَا جِحْتِ كَرِي۔

مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۳۲)

فرمایا کہ یہ چیزیں ہم نے تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے برتنے کے لیے پیدا کی ہیں۔ مطلب یہ ہے

کہ ان چیزوں کا تمھاری نفع رسانی کے لیے ہونا تو بالکل واضح ہے اور اس امر میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ سب نعمتیں تمھارے پروردگار کے فضل سے حاصل ہوتی ہیں تو اب تم سوچو کہ ان انعامات کے بعد تمھارے اوپر خدا کی طرف سے کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ آخری بات اگرچہ نفلوں میں مذکور نہیں ہے لیکن سیاق کلام سے یہ خود واضح ہے اس لیے کہ اوپر سے اصل بحث ہی یہی چلی آ رہی ہے کہ یہ ضدی اور مغرور لوگ اپنے رب کی ناشکری اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ ان پر خدا کے حقوق واضح نہیں ہیں یا یہ اپنی ذمہ داریوں کے شعور سے نابلد ہیں بلکہ یہ جان بوجھ کر محض اکڑ اور ضد کے سبب سے پیغمبر کی کوئی بات اپنی خواہشوں کے خلاف سننے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

فَإِذَا جَاءَتِ الْعِقَابَةُ (۳۲)

عِقَابَةُ کے معنی بہری کر دینے والی کرک یا چیخ کے ہیں۔ جس طرح سورہ نازعات میں لفظ قیامت کی عِقَابَةُ آیا ہے اسی طرح اس سورہ میں لفظ صَاحَّةُ آیا ہے۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ صورت قیامت کی پہلی کرک ہی ایسی ہونے لگی کہ کانوں کو بہرا کر دے گی۔

اِذَا کا جواب، جیسا کہ سورہ نازعات کی آیات ۳۰-۳۵ کے تحت بیان ہو چکا ہے برائے وضاحت قرینہ مخدوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تعبیر پیغمبر کے انذار سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں لیکن اس دن کیا کریں گے جس دن خدا کا نادی اتنے قریب سے ان کو پکائے گا کہ اس کی آواز سب کے کانوں کے پرے پہاڑ دے گی۔

يَوْمَ نَبِّئُكَ لَمُومِنٌ اٰخِيهِ ؕ وَاٰمِيهِ ؕ وَاٰبِيهِ ؕ وَاَصْحَابِيهِ ؕ دَٰبِّيْنِيْهِ ؕ لِكُلِّ اٰمِرٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاتٌ يُّغْنِيْهِ (۳۲-۳۴)

یہ تفصیل ہے اس دن کی ہولناکی کی۔

یَوْمَ نَبِّئُكَ لَمُومِنٌ اٰخِيهِ ؕ وَاٰمِيهِ ؕ وَاٰبِيهِ ؕ وَاَصْحَابِيهِ ؕ دَٰبِّيْنِيْهِ ؕ اِذَا کا جواب نہیں ہے۔ اگر جواب ہوتا تو عربیت کے قاعدے سے اسلوب بیان اور ہوتا۔ جواب تو، جیسا کہ سورہ نازعات کی آیت یَوْمَ نَبِّئُكَ لَمُومِنٌ اِلَٰنَاتٌ مَا سَعَىٰ (النزعات - ۴۹، ۳۵) کے تحت گزر چکا ہے، مخدوف ہے البتہ اس سے مخدوف جواب پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج پیغمبر کے انذار سے انھوں نے اپنے کان جو بند کر رکھے ہیں تو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کو اپنی خانہ دانی اور قبائلی قوت و عصیت پر بڑا ناز ہے اس زعم نے ان کو اندھا کر رکھا ہے کہ بھلا ان کو ان کے مقام سے کون ہلا سکا ہے یا ہلا سکے گا لیکن اس بہری کر دینے والی چیخ کے بعد جو دن آئے گا وہ ایسا ہولناک ہو گا کہ ہر ایک پر نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ نہ بھائی اپنے بھائی کی فریاد سنے گا، نہ بیٹا اپنے ماں باپ کی دہائی پر کان دھرے گا اور نہ کوئی اپنی بیوی اور بیٹوں کی مصیبت میں ان کا شریک بننے کا حوصلہ کرے گا۔ اس دن ہر ایک کو اپنی ہی ایسی پٹری ہوگی کہ کسی دوسرے کی تعمیر نے کا وہ کوئی تصور ہی نہ کر سکے گا اگرچہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز ہو۔

یہی مضمون سورہ صارج میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔

وَلَا يَسْتَلِ حَمِيمًا ۖ يَعْسُرُونَ لَهُمْ
 يُودُّ الْمُحْسِنُونَ لَوْ يُعْتَدِي مِنْ عَذَابٍ
 يَوْمَئِذٍ بَيْنِيهِ ۖ وَصَاحِبْتَهُ وَآخِيهِ ۖ
 وَفَضَّلْتَهُ الَّذِي تُوْبِيهِ ۖ وَمَنْ فِي
 الْأَرْضِ حَمِيمًا ۖ ثُمَّ نُنَجِّيهِ ۖ
 (المعارج - ۱۰: ۴۰-۴۱)

ان دونوں آیتوں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں رشتہ داروں کی ترتیب اُبعد سے اُقرب کی طرف سے اور اس آیت میں اُقرب سے اُبعد کی طرف اور یہ دونوں اسلوب، بلاغت کلام کے تقاضے سے اختیار کیے گئے ہیں اور یہ بلاغت بالکل واضح ہے۔

وَجُودًا يَوْمَئِذٍ مُّسْفَرَةً ۖ فَصَاحِكَةٌ مُّتَبَشِّرَةٌ ۖ وَوَجُودًا يَوْمَئِذٍ عَلَيْهِمْ غَبْرَةٌ ۖ
 تَرَهَقَهَا تَرَةً ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجْرَةُ (۲۸-۲۷)

اس دن اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان جو فرق ان کے چہروں سے نمایاں ہوگا، یہ آخر میں بالاجمال اس کی طرف اشارہ کر دیا تاکہ ان کے اس ظاہر سے ان کے باطن کا کچھ اندازہ ہو سکے کہ اہل ایمان کے دل اس دن کن امیدوں اور حوصلوں سے معمور ہوں گے اور اہل کفر کے دلوں پر اس دن کیا گزر رہی ہوگی۔
 'مُسْفَرَةٌ' کے معنی روشن اور تابناک کے ہیں۔ یہ 'اسفوا الصبح' کے محاورے سے ماخوذ ہے۔ مسرت کی پہلی چمک جو اہل جنت کے چہروں پر ہی ہر ہوگی یہ لفظ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔
 'فَصَاحِكَةٌ' بھی مسرت اور خوشی کی تعبیر ہے یعنی ان کے چہرے ہنستے ہوئے ہوں گے۔
 'مُتَبَشِّرَةٌ' یعنی ہشاش بشاش ہوں گے۔

اہل کفر کے چہروں کا جو حال ہوگا اس کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ وَوَجُودًا يَوْمَئِذٍ عَلَيْهِمْ غَبْرَةٌ ۖ تَرَهَقَهَا تَرَةً ۖ کہ ان پر خاک اُڑ رہی اور سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ اس لیے کہ ان پر امید کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔
 'أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجْرَةُ' یہ آخر میں ان کی فرد قرار دینا اور ان کی طرف اجمالی اشارہ ہے کہ ان کا یہ حشر اس وجہ سے ہوگا کہ یہ خدا کے ناشکرے اور اس کے باغی و نافرمان رہے ہیں۔
 اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام کو پہنچی۔ وهو الموفق للصواب۔

رحمان آباد

۲۱ - مئی ۱۹۷۹ء

۲۲ - جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ